ہدایت چاہیے

نگہت ہاشمی

النور پبلیکیشنز

ہدایت چاہیے

نگہت ہاشمی

النور پبلیکیشنز

نام کتاب : ہدایت چاہیے
مصنّفہ : نگہت ہاشمی
طبع اوّل : جولائی 2006ء
تعداد : 2100
ناشر : النورانٹرنیشنل
فیصل آباد : 103 سعید کالونی نمبر 1، کینال روڈ، فون: 1851 872 - 041
بہاولپور : 7A، عزیز بھٹی روڈ، ماڈل ٹاؤن اے، فون: 2875199 - 062
2885199، فیکس : 2888245 - 062
ملتان: 888/G/1 بالمقابل پروفیسرز اکیڈمی بوسن روڈ گلگشت
فون: 6383 451 - 061
ای میل : alnoorint@hotmail.com
ویب سائٹ : www.alnoorpk.com
مطبع :

قیمت :

ابتدائیہ

علامہ اقبالؒ نے یہ دعا کی تھی:

؎ یا رب ! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

محترمہ نگہت ہاشمی صاحبہ **النور انٹرنیشنل** فیصل آباد کے 'تعلیم القرآن کورس 2005-06' میں جس انداز سے قرآنِ پاک پڑھا رہی ہیں، وہ جہاں ایک طرف انسان کو زندہ تمنا عطا کرتا ہے وہاں دوسری طرف اس کی زندگی کو رہنما اصول اور عمل کے راستے بھی فراہم کرتا ہے۔ قرآن پڑھتے ہوئے یہ بات مسلسل ذہن میں رہی کہ اس پیغام سے آواز کی صورت میں تو ہال کے اندر موجود چند سو طالبِ علم اور کیسٹس یا سی ڈیز استعمال کرنے والے فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن printed material کی اہمیت بہرحال اپنی جگہ ہے۔ اگر اس کو لکھ کر پرنٹ کروالیا جائے تو کتنے ہی قارئین اس سے استفادہ کرسکیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ان لیکچرز کو کاغذ کی قید میں لانے کی کوشش کی ہے۔

'ہدایت چاہیے' سورۃ الفاتحہ کی تفسیر پر مبنی کتابچہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

''انسان کے وجود کا مقصد تب پورا ہوتا ہے جب وہ اپنے مقام کو پہچان لیتا ہے اور جب وہ اپنے ربّ کے مقام کو پہچان لیتا ہے۔اللہ تعالیٰ اور بندے کے بیچ سچا تعلق یہ ہے کہ انسان اپنے ربّ کو پہچان لے،اسی پہچان کی وجہ سے اللہ رب العزت کے ساتھ اس کا صحیح اور سچا تعلق جڑے گا۔''

یہ وہ جذبوں سے بھرپور جملے ہیں جو ایڈوانس ڈپلومہ ان اسلامک ایجوکیشن کورس میں قرآنِ پاک کا آغاز کرواتے ہوئے ادا کیے گئے تو سننے والوں کی آنکھوں میں وہ حسرت دکھائی دی جو رب العزت سے تعلق جوڑنے کی تڑپ لیے ہوئے تھی۔پھر جس انداز میں اس تعلق کے عملی راستے بتائے گئے، ہر فرد کے لیے یہ عزم کرنا آسان ہو گیا کہ اللہ رب العزت سے سچا تعلق قائم کرنے کے لیے ان عملی نکات پر عمل کرنا ہے۔امید ہے کہ پڑھنے والوں کو بھی اس سے تعلق باللہ کی منزل کے رہنما نشانات ملیں گے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ قرآنِ پاک کے اس پیغام کو ساری دنیا تک پہچانے کے لیے'خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھایئے' کے اصول پر عمل پیرا ہو جائیں۔ان کتابچوں کے بارے میں آپ کی قیمتی رائے اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔

دعوہ سیکشن

النّور انٹرنیشنل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ [1]

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ [2] الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ [3] مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ [4] اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ [5] اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ [6] صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ [7] [الفاتحہ]

’’شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔
تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا ربّ ہے۔ نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔‘‘

سورۃ الفاتحہ قرآنِ حکیم کی سب سے پہلی سورۃ ہے، اس میں سات آیات اور ایک رکوع ہے۔ ایسی سورۃ جو بار بار دہرائی جانے والی ہے، جس کا نبی ﷺ نے مختلف ناموں سے تذکرہ فرمایا:

☆ اُمُّ الْکِتَابُ [کتاب کی ماں]

☆ اُمُّ الْقُرْآن [قرآن کی جڑ]

☆ اَلْاَسَاس [بنیادی کتاب] ☆ اَلْکُنْز [خزانہ]

☆ اَلشِّفَاء [صحت] ☆ الرُّقیة [دم]

یہ سورۃ انتہائی اہمیت کی حامل ہے، اس کے بنیادی مضامین کو دیکھیں تو

[1] سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعارف ہے۔

[2] پھر اللہ تعالیٰ اور بندے کا رشتہ ہے۔

[3] پھر انسانوں کی تین اقسام کا ذکر ہے۔

آیئے اس سورۃ کے حوالے سے اپنی زندگی کے لیے رہنمائی تلاش کریں:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ [1]

''شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔''

سورۃ کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام سے ہو رہا ہے، صرف یہی سورۃ نہیں قرآنِ حکیم کی ایک سو تیرہ [113] سورتیں ہیں جن کا آغاز بِسْمِ اللّٰہ سے ہوتا ہے اور ایک سورہ النمل کی آیت 30 میں پوری بِسْمِ اللّٰہ آتی ہے۔

بسم اللہ سے آغاز کرنے کا ربّ العزت نے کب سکھایا؟ اس سورۃ کے نزول سے بھی پہلے۔ جب پہلی وحی آئی تھی تو اس وقت یہ ادب اللہ تعالیٰ نے سکھایا تھا کہ آپ کے ہر

کام کا آغاز آپ کے ربّ کے نام سے ہونا چاہیے۔فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ[العلق:1]

''پڑھو[اے نبی ﷺ!] اپنے ربّ کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔''

اسلام جو طرزِ زندگی ہمیں سکھاتا ہے، اس میں اللہ ربّ العزت کا نام، اللہ تعالیٰ کی ذات بے انتہا اہمیت کی حامل ہے، یہاں پر ربّ العزت نے اپنی دو صفات کا تذکرہ فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔''

دونوں میں مشترکہ صفت رحمت کی ہے۔اگر ہم اپنی زندگی میں اس کی رحمتیں دیکھنا چاہیں تو سب سے بڑی رحمت جو ہمیں محسوس ہوتی ہے اگرچہ وہ کائنات کے اعتبار سے سب سے بڑی رحمت نہیں لیکن ہمارے لحاظ سے ہے یعنی ہمارا ''انسان'' ہونا۔ایسا ہو سکتا تھا کہ

ہم کسی چھپکلی کی صورت میں پیدا ہو جاتے۔

کسی سانپ کی شکل میں۔

کسی مچھر، مکھی کی صورت میں۔

ہم مگر مچھ جیسے ہوتے۔

دریائی گھوڑے کی طرح ہوتے۔

ہم لوگوں کے پاؤں تلے آنے والی چیونٹی کی طرح ہوتے۔

یہ اس کی رحمت ہے، خالصتاً اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں نسلِ انسانی میں پیدا کیا۔اس کی ذات کا اتنا بڑا کرم ہے کہ جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔

اگر ہم اپنے وجود کے حوالے سے دیکھیں تو اس وجود پر اللہ تعالیٰ کی کتنی رحمتیں ہیں، اس نے ہمیں صحیح سلامت آنکھیں دیں، صحیح سلامت کان دیے، صحیح سلامت زبان دی، صحیح

سلامت ذہن دیا، صحیح سلامت دل دیا، کتنے لوگ ہیں جن کے اعضاء میں نقص ہوتا ہے، اس نے ہم میں کوئی نقص نہیں رکھا یہ اُس کی رحمت ہی تو ہے۔

پھر آپ یہ دیکھیں کہ بچپن سے لے کر آج تک اس نے ہمیں رزق دیا، اس نے ہمیں کھانے پینے کو سب کچھ مہیا کیا۔ ہمیں اپنے گھروں کو روشن کرنے کے لیے کتنی روشنیوں [lights] کی ضرورت پڑتی ہے؟ لیکن رحمتیں کرنے والے ربّ نے ہمیں ایسی روشنی دے دی جس کا ہمیں کوئی بِل ادا نہیں کرنا پڑتا حالانکہ اس کے لیے انتظام بہت بڑا ہے، اتنا بڑا سورج صرف اسی خدمت کے لیے ہے، روشنی مسلسل سورج سے زمین تک پہنچائی جاتی ہے۔ ایسے ہی چاند سے روشنی مسلسل رات کے وقت زمین پر پہنچتی ہے۔ اس کے انتظامات تو دیکھے، ٹھیک ہے اس کائنات پر بھی رحمت ہے لیکن ہماری ذات پر بہت بڑی رحمت ہے۔

پھر اس کی ذات کا ہم پر کتنا بڑا اکرم ہے کہ اُس نے ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا کیا۔

وہ چاہتا تو ہمیں

کسی ہندو گھرانے میں پیدا کر دیتا۔

کسی یہودی گھرانے میں پیدا کر دیتا۔

کسی بدھ گھرانے میں پیدا کر دیتا۔

کسی عیسائی گھرانے میں پیدا کر دیتا۔

ہم اپنی جگہ رہ کر شاید اس چیز کا احساس نہیں کر سکتے کہ ایک انسان کی جو مائنڈ سیٹنگ [mind setting] بچپن میں ہو جاتی ہے، بڑے ہو کر اسے کوئی اور چیز قبول کرنی پڑے تو کتنا مشکل لگتا ہے؟ یہاں پر بیٹھے ہوئے ہم اُس تکلیف کا احساس نہیں کر سکتے جو اہلِ مکہ کو لاحق تھی، جو عموماً غیر مسلم سوسائٹی کو لاحق ہو جاتی ہے جب لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے ہیں یا جب انہیں اسلام کی دعوت دی جاتی ہے۔ اسلام کی دعوت پر جو ردِّعمل [Reaction]

مکہ میں پیدا ہوا اگر ہم چاہیں تو اسے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

ذرا سوچئے، اللہ کے رسول ﷺ کو کیوں تکلیف دی گئی تھی؟

آپ ﷺ کی پیدائش پر خوشیاں منانے والا چچا جس نے خوشخبری لانے والی لونڈی کو آزاد کر دیا تھا، جب آپ ﷺ نے اسے اور باقی تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے کہا۔۔۔تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں تم نے ہمیں اس لیے بلایا تھا۔

محبت کرنے والے دلوں کا رخ پھر جائے، لوگوں کی التفات بھری نظریں بے رحم بن جائیں، تعلقات میں اس بے رحمی کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اتنی زیادہ اذیت اُٹھاتا ہے، وہ دُکھ آج محبت بھرے رشتوں کے درمیان رہتے ہوئے ہم شاید محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان تکالیف سے، ایسے ردِعمل سے بچایا ہوا ہے، اس نے ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا کیا، پیدائشی طور پر ہی سہی لیکن ہمارا اسلام سے ایک واسطہ، ایک تعلق ہے۔ یہ اس کی ذات کی بڑی رحمت ہے، اس کی بڑی مہربانی ہے۔

قرآنِ حکیم سے ہمیں رحمت کا ایک اور سلسلہ بھی ملتا ہے۔ جیسے انسان ہونا رحمت، رزق کا اہتمام ہونا رحمت، ہر چیز کا صحیح سالم ملنا رحمت، رشتوں کی محبت رحمت، مسلمان ہونا رحمت، اسی طرح سے سب سے بڑی رحمت جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ لا عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ط [الرحمن 2,1]

''نہایت مہربان [خدا] نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے''۔

اللہ رب العزت نے اسی قرآن میں سکھایا:

''اللہ تعالیٰ کے نام سے جو رحمٰن ہے، رحیم ہے۔''

انسان اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی انسان کی طرف توجہ

فرماتے ہیں جس کی وجہ سے

☆ وہ بُرے کاموں سے بچ جاتا ہے۔

☆ اس کو پتہ چل جاتا ہے کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام بُرا ہے۔

☆ اس کی ذہنیت صحیح رُخ اختیار کر لیتی ہے۔

☆ اس کا کام اچھے انجام کو پہنچتا ہے۔

☆ اس کو یہ یقین مل جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا تو وہ میری مدد ضرور فرمائے گا۔

یہ اسلامی آداب میں سے پہلا اصول ہے کہ جو کام بھی کرنا ہے آغاز اللہ تعالیٰ کے نام سے ہوگا۔ تمام مسلمان کھانے کا آغاز کریں تو اللہ ربّ العزت کے نام سے، میری چھوٹی بیٹی کھانے کی ٹیبل پر اپنے والد سے پوچھ رہی تھی کہ کیا آپ نے کھانے سے پہلے بِسْــــمِ اللہ پڑھی تھی؟ ابھی انہوں نے جواب نہیں دیا تھا تو کہنے لگی کہ اچھا آپ بھول گئے ہیں تو اب بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهُ وَ آخِرَهُ پڑھ لیں۔

اسی طرح انسان جب سواری پر سوار ہونے لگے تب بھی یہ دُعا پڑھتا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِهَا وَ مُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [ھود:41]

''اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی، میرا ربّ بڑا غفور ورحیم ہے''۔

ایک مسلمان کی زندگی میں ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ بسم اللہ پڑھنے کا مطلب کیا ہے؟ کہ میں نے اب اللہ تعالیٰ کی ذات کو اپنے آگے رکھ لیا، وہی سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے، اُس کا یہ حق ہے کہ ہم سب سے زیادہ اُسی کا شکر ادا کریں۔ پھر فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [2]

''تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا ربّ ہے۔''

اَلْحَمْدُ کا مطلب ''تعریف'' بھی ہے اور ''شکر'' بھی۔

اَلْــحَــمْــدُ کے رشتے کو دیکھیں کس چیز کے ساتھ جا کر جڑتا ہے؟۔۔۔۔رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کے ساتھ، اللہ تعالی جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

اللہ کون ہے؟۔۔۔ربّ۔

ربّ وہ ہے جو پالتا ہے۔

ربّ وہ ہے جو نشوونما دیتا ہے۔

ربّ وہ ہے جو ہر چیز کے لیے تدبیر اور انتظام کرتا ہے۔

ایک چھوٹے سے بیج کو جب بویا جاتا ہے تو اس کو ایسی زمین چاہیے جہاں نمکیات بھی ہوں، جہاں سے نمی بھی ملے، اس کو باہر سے ہوا بھی چاہیے، سورج کی روشنی بھی چاہیے، حرارت بھی چاہیے، اس کو زمین کے اندر اُگنے کے لیے دو طرح کی قوت چاہیے۔ جڑ کو زمین کے اندر اُترنے کے لیے اور کونپل کو زمین سے باہر نکلنے کے لیے، پھر جب کونپل باہر نکلتی ہے تو اسے ماحول سے تحفظ بھی چاہیے، پھر کس طرح سے ایک چھوٹے سے بیج سے پورا پودا بنتا ہے۔ بیج سے پورے درخت تک اور پھر بیج سے پھل تک پہنچانے والا ربّ ہے جو بتدریج نشوونما کرتا ہے، ترتیب کے ساتھ اور ہر سٹیج پر محافظ ہوتا ہے۔

اسی طرح سے ماں کے پیٹ میں جب بچے کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک چھوٹا سا خلیہ ایک کامل انسان بن جاتا ہے، خون کا لوتھڑا، گوشت کی بوٹی، پھر ہڈیاں، پھر ہڈیوں کے اوپر گوشت، اس کے بعد پورے کا پورا انسان۔۔۔کیسی خوبصورت

شکل وصورت والا انسان بن جاتا ہے۔ یہ شکل وصورت ابتداء میں ایسی نہیں تھی، نہ ناک تھا، نہ کان، نہ ہونٹ تھے، نہ جسم کا کوئی حصہ مکمل تھا تو

ربّ وہ ہے جو ذرّے سے پورے کے پورے وجود کو بنا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

پھر اگر ہم اُسے رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کے حوالے سے دیکھیں تو ربّ وہ ہے جس نے سارے انسانوں کو پیدا بھی کیا اور سارے جہانوں کی تدبیر اور انتظام کرنے والا بھی ہے تو وہ صرف ربّ نہیں ہے، ربّ العالمین ہے۔ایک انسان اگر ایک چپاتی کھانا چاہتا ہے تو کائنات کی کتنی چیزیں شامل ہوتی ہیں، گندم کے دانے کو پورا اگنے اور بڑھنے کے لیے صرف زمین کی قوت درکار نہیں، جو روشنی اس کو چاہیے وہ زمین کی نہیں ہے، جو حرارت اس کو چاہیے وہ بھی سورج سے آتی ہے، پھر زمین پر جو water cycle چلتا ہے اور پانی کا جو انتظام ہے، سمندروں کا پانی ٹنوں کے حساب سے سورج کی حرارت کی وجہ سے خشک ہوتا ہے، اوپر جاتا ہے، بادلوں کی شکل اختیار کرتا ہے، بادلوں کو اُڑنے کے لیے ہوائیں چاہئیں، ہواؤں کے پیچھے اللہ ربّ العزت کا آرڈر چاہیے پھر وہ اپنی جگہ پر پہنچتا ہے، پھر بادلوں سے پانی برستا ہے، پھر زمین سیراب ہوتی ہے، جن زمینوں پر لمبے عرصے تک بارش نہیں ہوتی ان کا پانی بہت نیچے اتر جاتا ہے جس کی وجہ سے خشک سالی ہو جاتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے ایک کام کے ہونے میں کتنی قوّتیں مصروفِ عمل ہو جاتی ہیں۔
اگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ربّ العالمین ہے تو اس وجہ سے کہ ہر جگہ پر اسی کا حکم چلتا ہے، اسی کے حکم کی وجہ سے ہی یہ سارا انتظام ہوتا ہے۔اتنی بڑی کائنات میں ایک چھوٹی سی زمین اور اس پر بسنے والے جاندار، پودے، جانور، سمندر میں رہنے والے فضاؤں میں پرواز کرنے والے پرندے، فقط اتنی بات اگر دیکھیں کہ ہر روز جب صبح ہوتی ہے تو ہر جاندار بھوکا ہوتا ہے اور ہر ایک کی خوراک مختلف ہے۔صرف انسانوں کو دیکھیں تو سب ایک جیسا

ناشتہ ہی نہیں کرتے، مختلف افراد کے ناشتے کی کیفیات مختلف ہیں۔سب بھوکے ہوتے ہیں اورسب کواللہ تعالیٰ کی جانب سے رزق عطا کیا جاتا ہےتو رزق کا انتظام کرنے والا وہ ربّ ہے۔اسی لیے انسان کو یہ سکھایا گیا کہ کہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ[2]

''تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا ربّ ہے۔''

اسلامی تصورِحیات کا یہ دوسرا اصول ہے کہ انسان کو جو نعمت ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرے،اسی کی تعریف کرے۔اللہ تعالیٰ کی تعریف وہ شعور ہے جو اس کا نام آتے ہی، اس کا ذکر ہوتے ہی بندے کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر اور اسی کی تعریف ہے جو سارے جہانوں کا ربّ ہے۔

اگر ہم دیکھیں تو اس دنیا میں کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس تصور کو سمجھنے میں معاون اور مددگار ہوتی ہیں۔آج کل سائنسدان تحقیقات کر رہے ہیں کہ زمین کے علاوہ اور کہاں کہاں زندگی کے آثار موجود ہیں،سارے سیاروں پر زندگی کے امکانات تلاش کیے جا رہے ہیں، چاند پر انسان نہیں بس سکتا کیونکہ چاند پر تو پانی نہیں ہے،آکسیجن نہیں ہے۔انسان مشتری پر بسے،عطارد پر بسے،نیپچون پر بسے،قریب کی کہکشاں کے حوالے سے دیکھیں کہیں ایسا امکان نظر نہیں آتا،اب ایک سیارے کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ وہاں بسا جا سکتا ہے[و اللہ اعلم]۔

اب اس ربّ **العالمین** کو دیکھیں کہ اس نے زمین جیسے سیارے کو ہمارے لیے کیسا بنایا؟ ہمارے قدموں تلے اگر بہت نیچے جائیں تو بھڑکتا ہوا لاوا ہے،بھڑکتی ہوئی آگ ہے، تھوڑا اوپر آئیں تو کتنی تہیں [layers] ہیں،تیل ہے[ہر جگہ نہ سہی لیکن مختلف جگہوں پر اس

کے ذخیرے موجود ہیں]، گیس کے ذخائر ہیں، ذرا اوراوپر آئیں تو پانی ہے، آگے معدنیات ہیں، پھر زمین کے اوپر کی تہہ کتنی ذرخیز ہے، اُگانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور پھر بیرونی تہہ دیکھیں تو سبزے سے بھرپور ہے، رنگ رنگ کے پھول ہیں، طرح طرح کی سبزیاں اور پھل ہیں، کیسی عجیب بات ہے کہ بھڑکتے ہوئے لاوے پر پھل پھول کھلے ہوئے ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کا انتظام اتنا کامل ہے۔ اس ربّ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے لیے یہ سارے انتظامات کیے۔

پھر آپ دیکھیں کہ ہماری زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، ہم وقت کا جو حساب کتاب لگاتے ہیں وہ اسی سے ممکن ہے۔ ہر روز یوں ہی صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے، یہ زمین یوں ہی سورج کے گرد چکر کاٹتی ہے۔ جو حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو حصہ سورج کے پیچھے ہوتا ہے وہاں رات ہوتی ہے، پھر یہی رات اور دن کا آنا جانا موسموں کی تبدیلی کا باعث بھی بنتا ہے۔ کبھی دن چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں تو ٹھنڈک بڑھتی چلی جاتی ہے، پھر جب دن بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں تو گرمیاں آتی چلی جاتی ہیں۔ آج اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ سورج اور چاند کے علاوہ ماہ وسال کا حساب لگانے کے لیے کیا کوئی اور ذریعہ ہوسکتا ہے تو معلوم ہوگا کہ نہیں۔ یہ اُس مالک کی مہربانی ہے، اُس کا کرم ہے کہ اس نے یہ سارا سسٹم ایسا بنادیا۔ اہلِ مدینہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا تھا جس کا تذکرہ قرآنِ پاک میں ملتا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ [البقرۃ 189]

”[اے نبی ﷺ !] لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔“

یہ دِنوں اور تاریخوں کا حساب کتاب کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے، اس کے پیچھے بھی اللہ تعالیٰ کا سسٹم ہے۔ دن رات کا آنا جانا بے مقصد نہیں ہے کہ خود سے خود دن آجائے اور خود سے خود رات ہو جائے، دن کام کے لیے ہے اور رات آرام کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا [النبا10-11]

''اور ہم نے رات کو پردہ پوش بنایا اور دن کو معاش کا وقت بنایا۔''

رب العزت کی بے شمار نعمتوں کے بارے میں ہی تو قرآن بتاتا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا [ابراھیم:34]

''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔''

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں اور انسان کے لیے ان میں ایمان کی غذا موجود ہے، مثلاً انسان کو بھوک لگتی ہے، جانوروں کو بھی لگتی ہے، پرندوں کو بھی لگتی ہے لیکن انسان کے لیے ربّ نے کیسا انتظام کیا؟ مثلاً حلال جانور ہیں جو صرف کھانے کے کام نہیں آتے، ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے حسن بھی رکھ دیا۔

پھر اسی طرح سے سبزیوں کو دیکھیں تو زمین کے اندر سے سفید رنگ کی سبزیاں نکلتی ہیں ہم اگر سفید رنگ کا کپڑا زمین کے اندر رکھ دیں تو کتنا میلا اور گندا ہو جائے، اس کا رنگ ہی خراب ہو جائے لیکن جب ہم مُولیوں کو زمین سے نکالتے ہیں تو کتنا Fresh رنگ ہوتا ہے۔ گاجر نکالیں تو اس کا رنگ سرخ ہے، شلجم نکالیں تو ان کا رنگ فرق ہے، چقندر نکالیں ان کا رنگ فرق ہے، آلوؤں کا رنگ فرق ہے اور یہ صرف رنگ کی بات نہیں ہے بلکہ ان کی

شکل،ان کی غذائیت اوران کا ذائقہ کتنا مختلف ہے۔درختوں پر لگے ہوئے پھل۔۔۔ انسان اِن کو دیکھے تو خود بخود ان کی طلب ہونے لگے جیسے آم۔ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ وہ زمین کے اندر ہوتے لیکن اللہ تعالیٰ نے کیسے ہمارے لیے ان کو جگہ جگہ پر ٹانگ دیا، یہ مختلف قسم کے غذائی پیکٹ ہیں قوت [Energy] سے بھرپور،اسی طرح سے انار ہیں،اَمرود ہیں، کیلے ہیں،انگور ہیں،مختلف پھل لٹکتے ہوئے کتنے خوبصورت اور پیارے لگتے ہیں،ذائقہ بھی ہے، رنگ بھی اوران کی شکل وصورت میں کتنی خوبصورتی ہے،کسی کی نزاکت میں اورکسی کی سختی میں،ہر چیز کتنی نادر ہے اورپیش کرنے کا انداز [presentation] کتنا زبردست ہے،اگر ان کی جگہ لنچ باکسز[lunch boxes]لٹک رہے ہوتے تو کیسا لگتا؟اللہ تعالیٰ نے کیسے انسان کی طبیعت اوراس کے ذوقِ جمالیات[asthetic sence] کا خیال رکھا ہے۔

دوسری چیز جوانسان کوسکھائی جارہی ہے وہ شکر کارویہ ہے۔انسان کے سیدھا رہنے کے لیے جس صفت کی ضرورت ہے وہ شکر ہے۔شکرگزاروہ ہوتا ہے جونعمت پاکر مُنعِم کی طرف متوجہ ہوتا ہے یعنی انعام دینے والے کی طرف،احسان کرنے والے کی طرف،یہی رویہ تو انسان سے مطلوب ہے۔انسان نعمت پاکر جب اکڑتا ہے تو یہی اکڑ تو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔جورویہ انسان کے لیے مطلوب ہے،ربّ العزت نے اتنی سادگی سے کلام کے بالکل شروع میں سکھا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زندگی میں کس طرح سے اس عنصر کو رکھا؟فرمایا:

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا [سبا:13]

”اے آلِ داوٗد!عمل کروشکر کے طریقے پر۔“

حضرت داوٗد علیہ السلام اللہ تعالیٰ نے شکرادا کرنے کی توفیق دی تھی،وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے

عاجزی کا اظہار کرتے تھے، اسی شکر کے اظہار میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچایا کرتے تھے؟ آلِ داؤد علیہ السلام پر ربّ کی نعمتیں تو دیکھیے کہ اِن میں حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسی بادشاہت دی تھی جو اور کسی کے پاس نہیں تھی، ہواؤں پر ان کا اختیار تھا، جانوروں، پرندوں کی بولیوں تک کو وہ سمجھتے تھے، جنّات پر کنٹرول رکھتے تھے۔ایک بار اُن کا لشکر چیونٹیوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! جلدی چلو، بھاگ چلو، سلیمان علیہ السلام کا لشکر آیا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں کچل دے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی وقت یہ دعا کی:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ [النّمل:19]

"اے میرے ربّ! مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اُس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عملِ صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔"

انسان کو جس مسئلے کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ نعمتیں پا کر بے قابو ہو جاتا ہے تو اپنے اوپر قابو پانے کے لیے یہاں پہلی ہدایت [Instruction] دی گئی۔ بے قابو انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔بِسْمِ اللّٰہ کہنا سکھا کر انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ

آپ نہیں، اللہ تعالیٰ ۔۔۔اللہ بڑا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے نام سے۔

دوسری بات اسے یہ سکھائی گئی کہ

آپ نہیں ۔۔۔۔۔تعریف کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

سورۃ الفاتحہ نماز میں لازمی طور پر پڑھی جانے والی سورۃ ہے۔اس کے توسط سے ربّ العزت نے سبق دیا ہے کہ

انسان ہر کام اپنے ربّ کے نام سے کرے۔

ہر کام کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

ہر نعمت ملنے پر اس کی تعریف کرے۔

اور پھر تعریف کیوں نہ ہو وہ تو ربّ العالمین ہے، سارے جہانوں کا ربّ ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا کتنا خوبصورت تعارف کروایا ہے۔اس سورۃ میں اللہ ربّ العزت نے اپنے آپ کو چار صفات سے متعارف کروایا ہے:

[1] الرّحمٰن [2] الرّحیم

[3] ربّ العالمین [4] مالک یوم الدین

قرآنِ حکیم میں جتنی دعائیں ہیں وہ ربّ کے نام سے شروع ہوتی ہیں۔ربّ اور بندے کا بڑا خصوصی تعلق ہے۔یہ الفاظ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ قرآنِ حکیم میں 6 بار استعمال ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفت ربّ قرآنِ حکیم میں 925 بار مختلف طرح سے استعمال ہوئی ہے، کوئی اور صفت اتنی بار استعمال نہیں ہوئی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ الفاظ کہے تھے:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ

[الشعراء77,78]

’’میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز ایک ربّ العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔‘‘

ربّ العزت کی ذات کے ساتھ تعلق کی ساری جہتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان الفاظ سے ہمیں ملتی ہیں کہ میرا ربّ تو وہ ہے

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ[الشعراء:78]

''جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔''

جس نے میرے وجود کو سارے راستے بتائے ہیں، زبان چکھنا جانتی ہے، ناک سونگھنا جانتا ہے، آنکھ دیکھنا جانتی ہے، کان سننا جانتے ہیں، ہم نے تو نہیں سکھایا، بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی ماں کے سینے سے چمٹتا ہے، وہ suck کرنا جانتا ہے، دودھ پینا جانتا ہے۔

جو میرے وجود کو یہ سب کچھ بتا سکتا ہے تو

کیا زندگی کی راہوں میں وہ میری رہنمائی نہیں کرے گا؟

وہ مجھے نہیں بتائے گا کہ میں نے زندگی کیسے گزارنی ہے؟

میری گفتگو کیسی ہو؟

میری چال ڈھال کیسی ہو؟

میری سماعت کیسی ہو؟

میرے معاملات کیسے ہوں؟

میں کیسے کماؤں؟ کیسے خرچ کروں؟

دنیا میں کیسی زندگی بسر کروں؟

کیا وہ مجھے نہیں بتائے گا۔۔۔؟

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ ربّ العزت کا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ[الشعراء:79]

''وہ ربّ مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔''

وہ پالنے والا ہے، سب کچھ اس کی عطا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ میری وجہ سے ہے، میرے والدین کی وجہ سے ہے لیکن جو ربّ پر یقین رکھتا ہے، اُس پر ایمان رکھتا ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے، جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، وہ میرے ربّ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعارف کروانے میں آگے بڑھتے ہیں:

وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ[الشعراء:80]

''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔''

وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ[الشعراء:81]

''وہ ذات ہے جو مجھے وفات دے گی، پھر مجھے دوبارہ زندہ کرے گی۔''

وہ کیسا ربّ ہے؟ اس نے ایک ابدی مخلوق کو بنایا۔ اس ابدی مخلوق کی زندگی میں جو موت کا تصور ہے وہ اس کے لیے انتہائی سوہانِ روح ہے لیکن یقین کرنے والا کیسے یقین کرتا ہے؟ کہ اگر وہ مجھے ایک بار وفات دے گا تو دوبارہ مجھے زندگی بھی دے گا۔ اِس کی ساری امیدیں اُسی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں کہ میرا تو وجود اسی سے ہے، میرا رزق اسی سے ہے، میری زندگی اسی سے ہے، میری موت اسی سے ہے اور میرا دوبارہ اٹھایا جانا اسی سے ہے اور پھر بہت ہی خوبصورت بات جو ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی:

وَالَّذِیٓ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَلِیۡ خَطِیۡٓئَتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ[الشعراء:82]

''جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ یوم جزا میں وہ میری خطا کو معاف کر دے گا۔''

تو ربّ وہ ہے جس کی ذات سے انسان امیدیں وابستہ کرتا ہے۔اسے جب یہ سکھایا گیا کہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ[2]

''سارا شکر، ساری تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو ربّ العالمین ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے بیچ سچا تعلق یہ ہے کہ انسان اپنے ربّ کو پہچان لے،اسی پہچان کی وجہ سے اس کے ساتھ اس کا صحیح اور سچا تعلق جڑے گا اور کائنات میں اس کی ایک صحیح حیثیت متعین ہو جائے گی،جیسے آپ ایک چھوٹی سی گھڑی [wrist watch] کو دیکھیں،اس کا کوئی پرزہ اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے تو وہ درست وقت نہیں بتاتی،اب وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا جس کے لیے اسے بنایا گیا تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک چیز جب اپنی جگہ پر ہو تب ہی وہ قابلِ استعمال ہوتی ہے،تب ہی اس کے وجود کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

ایسے ہی انسان کے وجود کا مقصد تب پورا ہوتا ہے

جب وہ اپنے مقام کو پہچان لیتا ہے۔

جب وہ اپنے ربّ کے مقام کو پہچان لیتا ہے۔

اس سورۃ کی ابتداء میں ہی ربّ العزت نے اپنی پہچان کرا دی ہے۔انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں غفلت میں رہتے ہوئے،ربّ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے ہوئے،حواس سے محسوس نہ کرتے ہوئے اسے شبہ لاحق ہو جاتا ہے۔ایک

مسلمان ہونے کی حیثیت میں ہمیں اس طرح کے شبہے تو لاحق نہیں ہوتے جس طرح کے غیر مسلموں کو ہوتے ہیں لیکن بہرحال ربّ کی معرفت (پہچان) پھر بھی ویسی نہیں ملتی۔ سوچنے والے جب شبہے میں پڑتے ہیں تو پھر اس کا کوئی حل بھی تلاش کر لیتے ہیں لیکن جو سوچنا نہیں چاہتا تو نہ سوچنے کی وجہ سے پھر انسان کا تعلق بھی بن نہیں پاتا۔ دنیا میں بھی اُسی انسان کا تعلق دوسرے انسان سے بنتا ہے جو اس کے بارے میں کوئی سوچ رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل

[Out of sight, out of mind]

جو چیز دکھائی نہیں دیتی وہ پھر ذہن میں بھی نہیں رہتی۔ جو چیز نہ دکھائی دے، نہ ذہن میں موجود ہو، نہ ہی اسے سوچا جائے پھر اس کے ساتھ تعلق آخر کیسے بنے گا؟ تعلق رکھنے کا تو امکان ہی نہیں رہے گا۔

اس وجہ سے ربّ العزت نے اپنا تعارف کروایا ہے۔ اس تعارف سے ہی

انسان کی سوچ بدلتی ہے۔

اس کا عمل بدلتا ہے۔

اس کے اخلاق بدلتے ہیں۔

اس کے معاملات بدلتے ہیں۔

ایک انسان نے کام کا آغاز کیا تو کہا: بسم اللہ

کام اچھے انداز میں ہو گیا تو کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

دیکھئے۔۔۔۔بدل رہا ہے ناں انسان!

جس نے ربّ کی ذات کو دریافت کر لیا، اس کے معاملاتِ زندگی بدلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اتنا خوبصورت کلام ہے اللہ ربّ العزت کا، اتنا جامع [comprehensive]،

اتنے مختصر الفاظ میں پوری زندگی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ پھر اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں:

مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ [4]

''روز جزا کا مالک ہے۔''

آغاز اور انجام دونوں ربّ کے ساتھ منسلک ہیں، یہ دنیا جب ختم ہو گی تو ہر ایک کو اس کے اچھے اور بُرے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ جو بھلا کام کرنے والے ہوں گے ان کو بھلائی کی جزا اور جو بُرا کام کرنے والے ہوں گے ان کو برائی کی سزا ملے گی۔ کسی کا زور نہیں چلے گا، کسی کی سفارش نہیں چلے گی، کسی کا کوئی اختیار نہیں ہو گا سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کہ وہ مالک ہے روزِ جزا کا، مالکانہ حقوق محفوظ [reserved] ہیں۔ کوئی کتاب جب پرنٹ ہوتی ہے تو اس کے شروع میں ایک چھوٹا سا فقرہ لکھا ہوا ہوتا ہے ''جملہ حقوق محفوظ ہیں'' یعنی اب جس نے کتاب لکھی ہے، جس ادارے نے اسے چھپوایا ہے اُن کی اجازت کے بغیر اسے کوئی نہیں چھاپ سکتا، سارے حقوق مالک کے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں تو ہمیں یہ بات سمجھ آتی ہے مثلاً اگر آپ کی انگوٹھی گر جائے تو آپ اس کو تلاش کرتے ہیں اس لیے کہ آپ کو پتہ ہے کہ یہ میری ہے تو اسے مجھے ملنا چاہیے۔ اگر ایسا ہو کہ آپ کی گری ہوئی انگوٹھی کوئی اور اٹھا کر اپنے پاس رکھنا چاہے تو آپ فوراً بول اٹھیں گے کہ یہ تو میری ہے۔ کیوں؟۔۔۔ اس لیے کہ آپ نے اسے خریدا ہے، اس کی قیمت ادا کی ہے، اس کے اوپر اب آپ کے مالکانہ حقوق ہیں چاہے کتنے ہی محدود وقت کے لیے سہی، آپ کو اپنی ملکیت کا احساس ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات اس کائنات کی مالک ہے، وہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کے بنائے ہوئے انسان کے بارے میں کوئی خود سے اختیار رکھے۔ اس لیے اس نے فرمایا:

مَنۡ ذَالَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ [البقرة:255]

''کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟''

وہ چاہے گا تو سفارش کرنے کے لیے کسی کو اجازت دے دے گا بصورتِ دیگر اجازت نہیں ملے گی۔ یہاں سے ہمیں ہمارے ربّ کی پہچان، اس کی معرفت ملتی ہے۔ یہی معرفت اسلامی زندگی کی پہلی بنیاد ہے۔

کوئی نیک عمل نیک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اپنے مالک کو پہچان نہ لے۔

میں یہ اتنی بڑی بات اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ایک انسان جب یہ جانتا ہی نہیں کہ میں کوئی کام کس لیے کر رہا ہوں؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نیت خالص نہیں ہے۔ مثلاً کوئی ساری زندگی سچ بولتا رہتا ہے لیکن وہ مسلمان نہیں ہے، اس نے سچ اس لیے بولا کہ کسی نے اسے سچ بولنا سکھا دیا، بس اس کی یہ عادت ہو گئی۔ کیا اس سچ بولنے پر اسے جزا ملے گی؟ اگر اسے اپنے مالک کی شناخت نہیں ہے، اس پر یقین ہی نہیں ہے، ایمان ہی نہیں ہے تو اس سچ بولنے پر اسے کوئی صِلہ نہیں ملے گا۔ اسی طرح ایک انسان اگر ساری زندگی دیانت دار رہے لیکن ربّ کی خاطر نہ رہے تو اس کے لیے کوئی جزا نہیں حالانکہ وہ نیکی کا کام ہے۔ انسان بہت صدقہ و خیرات کرے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کی اُسے پہچان ہی نہ ہو تو وہ چاہے کروڑوں اربوں لگا دے اسے اللہ تعالیٰ کی ذات سے کوئی صلہ ملنے والا نہیں ہے۔ اس لیے یہ معرفت، یہ پہچان ضروری ہے اس کے بغیر نیک اعمال، نیک اعمال ہوتے ہی نہیں۔ پھر صرف یہ پہچان ہی کافی نہیں، اس کے بعد جو بڑی بات ہے وہ یہ کہ انسان اُسی کی خاطر جیے۔

آپ اپنی ذات کی مثال لیں۔ جب سے پیدا ہوئے، باپ کا نام ساتھ لگا ہوا ہے، ماں سے محبت ہے، تعلق ہے، باپ سے بھی، بہن بھائیوں سے بھی، انسان جیتا ہے تو اپنی

فیملی کے نام کے ساتھ، عام طور پر لوگ اپنے خاندان کی عزت اور بھلائی کے لیے جیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ کسی کی خاطر نہیں، میری خاطر جینا ہے، میرا اور آپ کا الگ تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں ہی سکھا دیا کہ کہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ [2]

''سب شکر، ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو ربّ العالمین ہے۔''

نبی ﷺ نے فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ [مسلم534]

''الحمدللہ کہنا میزان کو بھر دیتا ہے۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ بغیر شناخت کے، بغیر دِلی جذبات کے لفظوں میں وہ اثر نہیں ہوتا جو انسان کی زندگی میں بعد تک باقی رہ جائے۔ بندہ جب دلی جذبات کے ساتھ بات کرتا ہے تو اُس کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملات درست ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ کا شکر انسان کو کئی دفعہ شکر کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن بہر حال یہ کلمات ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور پھر مومن کو جو زندگی سکھائی گئی وہ یہ کہ آپ نے ہر کام کے اختتام پر، ہر نعمت کے ملنے پر الحمدللہ کہنا ہے۔ مثال کے طور پر کپڑے پہننے ہیں تو کہنا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ مَآ اُوَارِیْ بِہٖ عَوْرَتِیْ وَاَتَجَمَّلُ بِہٖ فِیْ حَیَاتِیْ [مشکوۃ]

''تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، شکر ہے اس ذات کا جس نے مجھے تن ڈھانپنے کے لیے یہ لباس عطا کیا جس سے میں اپنی زندگی کی زینت بھی حاصل

کرتا ہوں۔"

اسی طرح کھانا کھا کر فارغ ہونا ہے تو کہنا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ "تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔"

اسی طرح جب کوئی کام ختم کریں تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ. یہ صرف زبان کی بات نہیں ہے، یہ رویہ اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں اسے اپنا لے اور زندگی میں اپنانے کے لیے اس کے پاس بہت سارے راستے ہیں:

زبان سے کہہ کر۔

اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کر کے۔

اس کی راہ میں اپنا وقت لگا کر۔

اس کے راستے میں اپنی صلاحیتیں لگا کر۔

انسان کا سب سے بڑا شکریہ اس کی عملی زندگی ہے۔

اپنی عملی زندگی میں انسان جب اپنے ربّ کے آگے جھک جاتا ہے تو یہی سب سے بڑا شکر ہے۔ اس بات کا اعتراف کہ جو نظام اس نے دیا ہے وہ صرف کائنات کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ مجھ پر بھی وہی نافذ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے لوگوں کو اسی دین کی دعوت دی تھی، اس نظام کا پابند بنایا تھا، انہیں اس نظام کے تحت منظّم [organized] کر دیا تھا، یہ شکریہ ادا کرنے کا انتہائی طریقہ ہے۔ پھر اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں:

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ [4]

"انصاف کے دن کا بھی مالک ہے۔"

یہ آیت ہمیں اِس مادی دنیا سے اٹھا کر اُس یومِ حساب میں کھڑا کر دیتی ہے۔اس سے ہمیں اپنی زندگی کے بارے میں انتہائی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔یہ آیت ہمیں ایک ایسے منظر میں پہنچا دیتی ہے جہاں پر ساری انسانیت ربّ کے حضور حاضر ہے، جہاں پر قصوروار بھی ہیں اور بہت زیادہ اطاعت گزار بھی اور انسان فیصلے کا منتظر ہے۔اُس دن زمین اللہ تعالیٰ کے نور سے چمک اٹھے گی لیکن کتنی زیادہ گھبراہٹ ہوگی، انسان کہیں گے کہ ہمیں یہاں سے بھاگنے کا موقع مل جائے لیکن اُس دن کسی کے قدم اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

''ابنِ آدم کے قدم حشر کے میدان سے اٹھ نہیں سکیں گے جب تک کہ وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دے دے:

عمر کن کاموں میں گزاری؟

جوانی کن کاموں میں پرانی کر دی؟

علم کے مطابق کتنا عمل کیا؟

مال کہاں سے کمایا؟

کہاں خرچ کیا؟ [ترمذی 2416]

ساری زندگی، معیشت بھی، معاشرت بھی، پھر زندگی کو روشن کرنے والا علم بھی اور زندگی کو مناسب جگہ پر لانے والی کتاب کا علم اور اس کے مطابق عمل بھی۔

اُس دن کا وہ مالک ہے، فیصلے اس نے کرنے ہیں، اس کے فیصلے کے راستے میں کوئی حائل نہیں۔دنیا میں انسانوں کو جب کبھی غلط فہمی ہوئی اسی دن کے حوالے سے ہوئی۔آج انسان کا طرزِ عمل جتنا غلط ہے اسی دن کے حوالے سے ہے۔انسان کو یہ یقینِ کامل نہ ہو تو اس کی زندگی بدل جاتی ہے۔

جس کو حشر کی پیشی یاد نہیں ہوتی وہ نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کو خود پر حاکم نہیں سمجھ رہا ہوتا۔

وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات تو ضرور کر رہا ہوتا ہے لیکن اس ملاقات کے اس کی زندگی پر کوئی اثرات مرتب نہیں ہو رہے ہوتے۔

حشر کی پیشی کو کس طرح سے انسان فراموش کرتا ہے؟ وہ ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرنے والا فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ لا الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ لا فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ [الانفطار:6-8]

''اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا؟ جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔''

کیا کمی چھوڑی تھی؟

کیوں نظر انداز [ignore] کرتے ہو؟

کیوں توجہ نہیں دیتے؟

آپ دیکھیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں ان کی توجہ کی ہمیں کتنی ضرورت ہوتی ہے؟ ذرا سا کوئی توجہ نہ دے، بات نہ کرے، بات نہ سنے تو ہم کہتے ہیں آپ کو کیا ہوا؟ ہم سے کوئی غلطی ہوگئی؟ کیا کوئی بات آپ نے محسوس کر لی ہے؟ کچھ برا لگا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ اپنی ہی بنائی ہوئی مخلوق سے یہ فرماتے ہیں کہ کس چیز نے تجھے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟ کیا میں نے تجھے اچھی صورت میں ترکیب نہیں دیا؟ کیا کمی ہے؟ کیا بات ہے؟ آخر تم پوری طرح

سے توجہ کیوں نہیں دیتے؟ پھر خود ہی فرمایا:

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ [الانفطار:9]

''ہرگز نہیں بلکہ [اصل بات یہ ہے کہ] تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو۔''

تمہیں اس روزِ جزا کا احساس نہیں اور ربّ العزت نے جب یہ بات فرمائی کہ

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ[4]

''مالک ہے روزِ جزا کا۔''

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن کا سارا انصاف اسی کے حکم سے ہوگا، کسی کے ساتھ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ وہ اس دن کا مالک ہے جب ہر ایک کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی، اسے بتانا ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اس کو کیسا استعمال کر کے آئے ہیں؟ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنا تعارف اس حوالے سے کراتے ہیں کہ صرف اس زندگی کا تعلق نہیں، اُس زندگی کا بھی تعلق ہے۔

یہ آیت ہماری توجہ اس جانب مبذول کراتی ہے کہ انسان کمرۂ امتحان میں ہے۔ یہ زندگی امتحان ہے۔ جس دن رزلٹ آؤٹ ہوگا، جس دن ہم اپنی منزل تک پہنچائے جائیں گے، اس دن یہ احساس جتنا شدید ہوگا اس سے زیادہ شدید احساس آج چاہیے کہ وہ روزِ جزا کا مالک ہے۔

ہم آزاد نہیں ہیں۔

ہم خود مختار نہیں ہیں۔

ہم اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلے نہیں کر سکتے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے ضابطے میں گسے ہوئے ہیں۔

دیکھیں جب ہم سوتے ہیں آنکھیں بند ہوجاتی ہیں، کان سنتے نہیں حالانکہ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ذہن کچھ دیر کے لیے سوجاتا ہے، اُس طرح سے [active] نہیں ہوتا، [alert] نہیں ہوتا لیکن دل دھڑکتا ہے، انسان کے کتنے ہی اعضاء ہیں جو کام کرتے ہیں، آدھی زندگی۔۔۔آدھی موت۔اللہ تعالیٰ نے اس وجود سے ہمیں سمجھایا ہے کہ دیکھو اختیار کس کا ہے؟ انسان جتنا بھی جاگنا چاہے، بے حال ہوجاتا ہے، اسے نیند آتی ہے اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہتا۔

ع نیند کانٹوں پر بھی آجاتی ہے آرام کے ساتھ

اللہ تعالیٰ انسان کو احساس دلاتے ہیں کہ تمہیں اپنے وجود سے سبق نہیں ملتا کہ اس پر کس کا حکم چلتا ہے؟ تم سانس لیتے ہو، روک کر دکھا سکتے ہو؟ سوچیۓ! ہم سانس لیتے ضرور ہیں لیکن اس پر ہمارا اختیار نہیں ہے، ہمارے جسم میں خون دوڑتا ہے ہمارا اختیار نہیں ہے، ہمارا جگر کام کرتا ہے ہمارا کیا اختیار ہے؟ ہمارا جگر ٹھیک کام کرے تب بھی اختیار نہیں اور اگر اس میں کچھ مسئلہ ہوجائے تب بھی اختیار نہیں لیکن انسان اس زمین پر سب سے زیادہ اپنے اختیار کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو مالک کے سامنے انسان کی حیثیت کیا ہے؟ ربّ العزت فرماتے ہیں کہ یوں کہو:

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ [5]

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

یہ ہے بندے اور ربّ کا اصلی تعلق ۔صرف آپ کی ہم عبادت کرتے ہیں اور صرف آپ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔وہ معبود ہے تو ہم غلام ہیں۔

غلام کس چیز کا پابند ہوتا ہے؟

نہ اپنی مرضی سے سوچنا ہے۔

نہ اپنی مرضی سے عمل کرنا ہے۔

نہ اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کرنا ہے۔

وہ تو اپنے آپ کو حوالے[surrender] کر چکا۔ایک غلام تو پوری طرح اپنے مالک کے قبضے میں ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ جس دور میں پیدا ہوئے تھے اگر ہم اس دور کی مثالیں دیکھیں تو پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور غلاموں کو چھوڑ دیا جاتا تھا کہ جاؤ مانگ کر لاؤ۔ پھر جب وہ مانگنے کے لیے نکلتے تھے تو شاید اتنی بُری حالت ہماری سوسائٹی کے کُتوں کی بھی نہیں ہے جتنی بری حالت میں غلام رہتے تھے۔جسموں پر زخم، زخموں پر مکھیاں بیٹھی ہوئی اور بھوک کے مارے جان نکل رہی ہے، کوئی ترس نہیں کھاتا تھا، ایسی بری غلامی کہ جس کی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

''اپنی عورتوں اور اپنے غلاموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔'' [سنن دارمی 143]

رب العزت یہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! مالک کے مقابلے میں تمہاری حیثیت کیا ہے؟ مرتبہ[status] کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہو:

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

ربّ العزت کا یہ مطالبہ ہے کہ اپنی مرضی سے، اپنی خواہش سے اپنی آزادیٔ انتخاب [Freedom of Choice.] کو حوالے[surrender] کر دو۔ کہہ دو کہ ہم صرف آپ کی عبادت کرتے ہیں، ہم تو آپ کے غلام ہیں، نہ اپنی مرضی سے سوچیں گے، نہ اپنی خواہشات رکھیں گے نہ جذبات، نہ اپنی فکر رکھیں گے، نہ زندگی میں کوئی کام اپنی مرضی سے کریں گے۔

عبادت کا مطلب ہے۔۔۔غلامی۔

عبادت کا مطلب ہے۔۔۔اطاعت اور فرمانبرداری۔

عبادت کا مطلب ہے۔۔۔پرستش۔

عبد کا کام کیا ہے؟۔۔ ہمیشہ معبود کے آگے جھکا رہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی جوصفت بیان کی تو کہا:

نِعْمَ الْعَبْد "سب سے اچھا بندہ، سب سے اچھا غلام۔"

غلام کیا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اچھا لگتا ہے؟

☆ بہت زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔

☆ پلٹنے والا۔

☆ ہر معاملے کا فیصلہ ربّ سے لینے والا۔

ہم اِیَّاکَ نَعْبُدُ دن میں کتنی بار کہتے ہیں؟

فجر کی نماز میں چار بار، ظہر کی نماز میں تقریباً دس بار، عصر کی نماز میں چار یا آٹھ بار، مغرب کی نماز میں پانچ بار اور عشاء کی نماز میں کم از کم نو بار۔۔۔ایک دن میں اتنی بار اس عہد کو دہراتے ہیں، مسلسل اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہ "ہم صرف آپ کے غلام ہیں۔" غلامی کا عہد ہم اپنے ربّ سے کر چکے، پہلے وہ عہد ہمارے تحت الشعور میں تھا اور اب ہم نے شعوری طور پر اقرار کیا ہے کہ

لَآ اِلٰہَ "کوئی معبود نہیں ہے۔"

اِلَّا اللّٰہُ "سوائے اللہ تعالیٰ کے۔"

ہم کسی اور کی غلامی نہیں کر سکتے، صرف اللہ تعالیٰ کی غلامی کریں گے، صرف اس کی مرضی سے زندگی بسر کریں گے، اسی کی خوشی کے مطابق چلیں گے اور یہ چلنا انتہائی مشکل

ہے، یہی کام انسان سے ہوتا نہیں ہے۔وہ غلامی کرنا چاہے تو ایک قوت ایسی ہے، نہ نظر آئے، نہ ہی انسان اسے محسوس کر پائے لیکن پھر بھی اس کے ذہن پر اس کی بات اثر کر جائے، دل کے اندر تک اتر جائے، وہ ہمارا دشمن جو ہمیں ہماری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا، محسوس کرنے سے محسوس نہیں ہوتا۔

وہ وسوسے ڈالتا ہے۔

وہ ہمارے خیال کا رخ پھیرتا ہے۔

وہ ہماری توجہ ہٹاتا ہے۔

وہ ہمیں غافل کرتا ہے۔

اور ہم غلامی کا عہد کرنے کے باوجود غلام نہیں بن پاتے۔

ساری زندگی ہوگئی کوشش جاری ہے لیکن کوئی ایک دن بتا دیں کہ جب واقعی اللہ تعالیٰ کی غلامی کی تھی۔ کسی کام پر انسان مطمئن ہی نہیں ہے کہ واقعی اس نے پوری طرح سے اپنے آپ کو اپنے ربّ کے آگے جھکایا ہوا ہے۔ایک کوشش ہے، ایک محنت ہے جو ہم کر رہے ہیں، ہم صرف اللہ تعالیٰ کی غلامی کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے تو کہتے ہیں

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ[5]

”صرف آپ ہی سے تو ہم مدد چاہتے ہیں۔“

آپ کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔اگر دیکھیں تو زندگی کی اس کشتی کو چلنے کے لیے دو پتوار ضروری ہیں:

ایک عبادت کا۔

دوسرا استعانت کا۔

ایک طرف اگر غلامی ہے تو دوسری طرف استعانت۔

ایک کام بندے کا ہے اور دوسرا کام ربّ کا۔

بندہ غلام بننا چاہے تو بیچ میں شیطان آجائے۔شیطان سے بچانے والا کون ہے؟ ۔۔۔۔۔ربّ۔زندگی میں یوں تو بہت سے کاموں کے حوالے سے انسان مدد چاہتا ہے لیکن ایک مدد کی اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔وہ کون سی چیز ہے جس کے لیے انسان سب سے زیادہ اپنے ربّ کے آگے جھکتا ہے،سب سے زیادہ مدد مانگتا ہے اور اسے مانگنی چاہیے؟اس کا نام استعاذہ 'اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا' ہے۔

آپ دیکھیں اگر سورۃ الفاتحہ سے قرآن شروع ہو رہا ہے تو اختتام کس پر ہو رہا ہے؟ سورۃ الفلق اور سورۃ النّاس پر،دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کیا سکھایا ہے؟اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ[1] مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ [2] وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ[3] وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ[4] وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ[5]

''کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی،ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ [1] مَلِکِ النَّاسِ[2] اِلٰهِ النَّاسِ [3] مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵لا الْخَنَّاسِ[4] الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ [5] مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ[6]

”کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے ربّ، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی، اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔“

یہ مدد انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ شیطان صرف ایک ہی کام کرتا ہے، اگر سوچ ایک درست سمت میں جا رہی ہو تو اسے غلط سمت میں ڈال دیتا ہے۔ انسان پھر کوشش کر کے اسے صحیح سمت میں لاتا ہے لیکن شیطان پھر اسے دوسری طرف لے جاتا ہے۔ اس کے حملوں سے ہم کسی بھی طور پر بچ نہیں سکتے، خود اپنی قوت کے ساتھ تو ہرگز نہیں بچ سکتے، اللہ تعالیٰ کی مدد چاہیے اور خود اسی نے مدد مانگنا سکھایا۔ فرمایا

وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ [الاعراف:200]

”اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔“

انسانی زندگی میں جو چیز کسی کو کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے وہ اس کی سوچ ہے اور شیطان اسی سوچ کو کنٹرول کر لیتا ہے، سوچ بدل دیتا ہے۔ آپ کا ذہن جب کسی ایک چیز کے لیے تیار ہوتا ہے تو دوسری طرف کی چیز چاہے اس میں کتنی ہی Attraction موجود ہو جب تک آپ کا ذہن اس کے لیے تیار نہیں ہوتا، آپ وہ کام کرنے پر تیار نہیں ہوتے تو Mind Setting چاہیے، ذہن کی تسکین چاہیے۔

شیطان نے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ [الاعراف:17]

''میں آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے اِن کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔''

اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا:

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ [النسآء:120]

''وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے۔''

یہی اس کا طریقۂ کار ہے، یہی اس کے حربے ہیں کہ لالچ دیتا ہے۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو بھی یہی لالچ دیا تھا کہ اگر اس درخت کا پھل کھالو گے تو ابدی جنت پاؤ گے، کبھی موت نہیں آئے گی اور لازوال بادشاہت ملے گی، ہمیشہ جنت میں رہو گے، کبھی نکالے نہیں جاؤ گے۔

جب انسان کو ابدی جنت مل رہی ہو اور ایسی بادشاہت، ایسا اقتدار جس کے ساتھ وہ اپنی زندگی ہمیشہ سہولت کے ساتھ گزار سکے تو وہ ضرور متاثر [attract] ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذہن اور دل کے اندر جو جنت کا تصور رکھ دیا ہے اسی کی وجہ سے وہ دنیا میں جنت تلاش کرتا رہتا ہے اور یوں فریب میں آتا ہے۔ شیطان اسی راستے سے انسان کو دھوکہ دیتا ہے اور انسان دنیا میں صرف اس وجہ سے گمراہ ہوتا ہے کہ اس کی رغبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہونے کی بجائے اپنی خواہشات کی طرف ہو جاتی ہے۔ شیطان نے عملاً کوئی کام نہیں کرنا ہوتا، صرف انسان کی سوچ کا رُخ بدلنا ہوتا ہے، وہ اس کا آخرت کی طرف رُخ ہونے نہیں دیتا، اسے دنیا میں ہی اُلجھا کر رکھ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ دیکھو میرے اور تمہارے درمیان تعلق تو یہی ہے، یہی معاہدہ ہے۔ہم ہر روز یہ معاہدہ کتنی بار کرتے ہیں؟ صبح اٹھتے ہیں تو کرتے ہیں، دوپہر میں کاموں سے فارغ ہوتے ہیں تب کرتے ہیں، شام ڈھلنے لگتی ہے پھر کرتے ہیں، سورج غروب ہوجاتا ہے پھر کرتے ہیں، سورج نکلنے سے پہلے ایک بار پھر کرتے ہیں، اتنی بار کیا جانے والا معاہدہ:

اِیَّاکَ نَعۡبُدُوَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ [5]

''صرف آپ کی ہی ہم غلامی کرتے ہیں، صرف آپ سے مدد چاہتے ہیں۔''

انسان کو شیطان سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہیے۔ربّ العزت نے مدد مانگنے کا طریقہ بھی سکھایا کہ کہو:

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ [6]

''اے اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم دکھا دے۔''

صراط مستقیم سے مراد ہے سیدھا راستہ، وہ بے خطا راستہ جس پر آج تک اللہ تعالیٰ کے پیارے چلتے رہے، اس کی نظر میں جو پسندیدہ لوگ تھے، [The Most Wanted Personalities] سو دعا کرنی ہے کہ یا اللہ! ہمیں ان کے راستے پر چلا دے۔

ہدایت کا مطلب صرف لفظ سکھانا نہیں ہے، اس کا مطلب رہنمائی کرنا ہے اور رہنمائی کیسے ہوتی ہے؟۔۔۔۔راستہ دکھانا بھی اور اس پر چلانا بھی تو جب ہم کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے تو اس کا یہ مطلب بھی ہوتا ہے کہ یا اللہ! ہمیں اس راستے پر چلا بھی دے۔ہمیں اس راستے پر چلنے کے لیے آپ کی مدد چاہیے، آپ ہی نے دکھانا ہے اور

آپ ہی نے چلانا ہے۔ راستہ کون سا ہے؟ فرمایا:

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ

''اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔''

انعام کون سا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی شریعت۔

اللہ ربّ العزت کا دین۔

اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا طریقۂ زندگی [life style]

کتنی خوبصورت دعا ہے کہ اے اللہ! جب سے انسان زمین پر آیا، آپ کی ہدایت بھی ساتھ ساتھ آتی رہی لیکن جو لوگ اس ہدایت پر عمل کرتے رہے، ہمیں اس گروہ میں شامل کر دینا۔

اس گروہ میں کون کون لوگ شامل ہیں؟

سارے ہی انبیاء علیہم السلام، حضرت آدم علیہ السلام بھی، حضرت نوح علیہ السلام بھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی، حضرت ہود علیہ السلام بھی، حضرت لوط علیہ السلام بھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور وہ سارے نبی جن کا قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ تھے۔

لیکن انہوں نے تو بہت دکھ کاٹے۔

ہجرتیں کیں۔

اپنے علاقے میں انھیں رہنے نہیں دیا گیا۔

زندگی ان پر تنگ کر دی گئی۔

یہ لوگ اپنے آپ کو وقف کرنے والے تھے، وہی سوسائٹی جو اعلانِ نبوت سے پہلے

بہت زیادہ عزت کرتی تھی اب دشمن ہوگئی۔لوگوں کی نظروں میں وقار نہیں رہا لیکن ربّ العزت نے مانگنا سکھایا کہ کہو

''ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا''۔

دنیا کی زندگی میں تو اسی کو انعام سمجھا جاتا ہے کہ لوگ عزت کریں، اپنے پاس اتنا مال ہو کہ زندگی آسانی سے گزر جائے، نیک نامی ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نظروں میں اچھا مقام ہو لیکن پیغمبروں کو دیکھیے، ان کے دور میں ان کی بہت کم عزت رہی، چند افراد کے سوا ان کی کسی نے نہیں مانی۔

پھر ان پر انعام کیا تھا؟

دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت [Blessing] کیا تھی؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چاہے اذیتیں سہیں، مشقتیں سہیں، مصیبتیں برداشت کیں لیکن یہی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ

صراطِ مستقیم پر استقامت کے ساتھ چلتے رہے۔

سیدھے راستے کو نہیں چھوڑا۔

اصولوں پر کوئی سودے بازی نہیں کی۔

کوئی سمجھوتہ [compromize] نہیں کیا۔

ان کی نظر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر رہی۔

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے انہوں نے زندگی گزاری۔

فقط اپنی زندگی کی طرف توجہ نہیں کی۔

کوئی خانقاہی زندگی نہیں گزاری۔

انسانوں کے بیچ میں رہے۔

اوران کے لیے نمونہ بنے رہے۔

ان کی اولادیں بھی تھیں، بیویاں بھی تھیں، انہوں نے کمایا بھی، خرچ بھی کیا، بھرپور زندگی بسر کی۔ کہیں بھی کوئی جھول نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارتے رہے۔ تو آج اللہ تعالیٰ کا ہم سے بھی یہی مطالبہ [Demand] ہے، جوکوئی انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو اسے انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا پڑتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے ایک ساتھی آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: یارسول اللہ ﷺ خدا کی قسم! مجھے آپ ﷺ اپنے بچے سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔ میں گھر جاتا ہوں میرا جی نہیں لگتا، آپ ﷺ کی محفل میں آتا ہوں تو چین پاتا ہوں، جہاں بھی چلا جاؤں مجھے آپ ﷺ کی محبت کھینچتی ہے لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ جب میں اس جہان سے چلا جاؤں گا پھر میرے ساتھ کیا بنے گی؟ آپ ﷺ تو جنت کے اعلیٰ درجات پر ہوں گے اور مجھے تو اپنا پتہ نہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ جنت میں جگہ دیتے ہیں یا نہیں؟ مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ وہاں میرے ساتھ کیا بنے گی؟ نبی ﷺ نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی دے کر بھیج دیا:

فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ج وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا [النساء:69]

”وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔“

اللہ تعالیٰ کو آج کے دور میں بھی انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہی پسند ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اگر اپنی زندگی صحیح انداز میں گزارنا چاہتے ہو تو اس راستے پر چلو۔ کچھ باتیں اس حوالے سے توجہ طلب ہیں:

ایک تو یہ کہ انعام یافتہ لوگوں نے کبھی بھی اکیلے اکیلے، اپنے اپنے گھروں میں انفرادی زندگی بسر نہیں کی۔ انہیں ہمیشہ انسانیت کی فکر لاحق رہی، اس کی اصلاح کی بھی، اس کی آخرت کی کامیابی کی بھی اور اس کی خدمت کی بھی، تینوں کام ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو راستہ دکھایا ہے اس پر چلنے کے لیے یہ تینوں کام کرنے ناگزیر ہیں:

☆ انسانیت کی اصلاح کی فکر کرنا۔

☆ ان کے ساتھ ہمدردی رکھنا۔

☆ ان کی خدمت کرنا۔

انسان صرف مال کما کر کامیاب نہیں ہو سکتا، وہ صرف اچھے گھر بنا کر بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، اچھے بزنس سے بھی اسے کامیابی نہیں مل سکتی، صرف اپنے بچوں کی فکر کر کے بھی نہیں، انسان تب کامیاب ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر اس طرح سے چلتا ہے جس طرح سے پہلے لوگ چلے، جیسے انبیاء علیہم السلام چلے اور ان کی زندگی کا مشن تھا کہ وہ انسانیت کو اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلاتے رہے، انہوں نے ایسا ماحول بنایا جس میں رہ کر انسانوں کی ٹریننگ ہو، جہاں پر لوگ اکٹھے رہ کر کوششیں کاوشیں کریں

☆ باقی انسانیت تک ربّ کا پیغام پہنچانے کی بھی۔

☆ پھر آگے بڑھ کر جہاد کرنے کی بھی۔

اس کے بغیر کبھی انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلا نہیں جا سکتا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دعا کرو:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ [7]

''ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔''

یہاں پر دو گروہوں کا تذکرہ ہے:

ایک تو وہ افراد ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا۔

دوسرے وہ افراد ہیں جو گمراہ ہوئے۔

غضب کس پر ہوا؟

سب سے پہلے ابلیس پر ہوا تھا، اس کے بعد انسانوں میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے پر جس نے قتل کیا تھا اور اس کے بعد قوم نوح علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو غرق کر دیا۔ پھر قومِ ہود علیہ السلام پر، قومِ ثمود پر، قومِ لوط علیہ السلام پر، پھر اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا غضب قارون پر ہوا، ہامان پر ہوا، فرعون پر ہوا اور ان پر ہوا جنہیں اللہ تعالیٰ نے بندر بنایا تھا، جنہیں سؤر بنایا تھا تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اُن جیسے کام نہ کرنا۔

دوسرا گروہ گمراہوں کا ہے۔ گمراہ کون ہے؟

جو راستہ چھوڑ دیں۔

راستے پر آئیں سہی لیکن راستہ بدل جائیں۔

ان دو اصطلاحات کو سمجھے بغیر ہم انعام یافتہ لوگوں کی بات سمجھ ہی نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر ہوا جو سرکش ہوئے، جنہوں نے اللہ ربّ العزت کے راستے پر جانتے بوجھتے زیادتیاں کیں مثلاً یہودی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اکڑ اور تکبر کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس نے اللہ تعالیٰ کی نظر میں انہیں مغضوب بنا دیا۔

ان کے رویے کی ایک مثال دیکھتے ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کیسا تصور رکھتے تھے۔ ان کی کتابوں میں لکھا ہے اسرائیل [یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام] اور اللہ تعالیٰ کی ساری رات کُشتی ہوتی رہی اور آخرِ کار حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو کشتی میں پچھاڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے [نعوذ باللہ] ان سے کہا کہ اب مجھے جانے دے تو یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ پہلے مجھے برکت دے پھر میں آپ کو جانے دیتا ہوں۔

آپ تصور کی خرابی کو دیکھ سکتے ہیں کہ ایک شخص کو خدا سے بڑا ثابت کرنا ہے تو اس کے لیے کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں؟ انہوں نے اسی سرکشی میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو قتل کیا، کسی کو کنوئیں میں اُلٹا لٹکا کر مار ڈالا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ ان کا سر کاٹ کر ایک طوائفہ کو ٹرے میں رکھ کر پیش کیا گیا تھا۔ ان کی تاریخ میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ یہ پیغمبروں کا سر کاٹ کے شام کو سبزی بیچنے بیٹھ جایا کرتے تھے، یعنی ان پر اس چیز کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے کوئی قتل کیا ہے۔ اتنی سرکشی اور اتنی سخت دلی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے غصے کا اظہار کیا اور تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ قوم مسلسل تباہیوں کا شکار ہوتی رہی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو پکڑا، ان کے شرک کی وجہ سے ان پر ناراضی کا اظہار کیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور ہستیوں کو معبود بنانا شروع کر دیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کی لیکن یہ لوگ باز نہیں آئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی پانی کے ذریعے سے ہلاک کر دیا جس سے انسان نے کبھی خطرہ محسوس ہی نہیں کیا۔ آسمان سے بارش ہوئی، زمین سے پانی نکلنا شروع ہوا اور پھر ایسی صورتحال پیدا ہو گئی کہ ان افراد کے علاوہ کوئی جاندار زندہ نہیں بچا جن کو حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار کر لیا تھا۔

اسی طرح ہود علیہ السلام کی قوم کو دیکھیے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے مسلسل تبلیغ کی لیکن لوگوں

نے مان کر نہیں دیا تو اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے مسلسل تبلیغ کی لوگوں نے نہیں مانا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو روکا کہ آپ ناپ تول میں کمی نہ کرو تو انہوں نے کہا: اب یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، آپ کی بات مان کر ہم اپنی تجارت کا نقصان تو نہیں کر سکتے، وہ قوم مالی بدعنوانیوں کا شکار تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو دیکھیے تو جنسی بے اعتدالیوں میں مبتلا تھی، جتنا بھی روکا گیا نہیں رُکے تو ان پر حجت تمام ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹا کر رکھ دیا۔

میں سوچتی ہوں کہ آج کون سی ایسی بری خصوصیت ہے جو ہماری قوم میں موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار نہیں ہو سکتی؟

کیا آج ہم اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار نہیں ہیں؟

کیا آج آنے والے یہ زلزلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری آخری پکار نہیں ہیں؟

جب سے ملبے کے ڈھیر سے 64 دن بعد نقشہ بی بی زندہ باہر آئی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ انجام قریب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ قوموں کو معجزات دکھاتے ہیں اس کے بعد اس کی طرف سے ان کے انجام کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ آج ہر ایک کی توجہ اس طرف جا رہی ہے کہ اچھا بڑی بات ہے اتنے دنوں کے بعد بھی زندہ بچ گئی ہے، ایک اور ہی طرح کے سلسلے کو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔ باپ سے، بھائی سے اس کی ملاقات دکھائی جا رہی ہے، سب باتیں اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن جو اصل چیز ہے وہ اُجاگر نہیں کی گئی کہ پیدا کرنے والا ربّ ہے، مارنے کی قوت بھی وہی رکھتا ہے، وہ نہ مارنا چاہے تو مادی اسباب چاہے جواب دے دیں، عقلِ انسانی دنگ رہ جائے لیکن وہ زندہ رکھنا چاہے تو اصحابِ کہف کو ساڑھے تین سو سال تک بھی زندہ رکھ سکتا ہے، اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ دکھانا چاہتے ہیں کہ قوت، طاقت، اقتدار تو میرا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ایک یہی بات انسان کی سمجھ میں نہیں آتی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ مغضوب اور گمراہ لوگوں کی جو نشانیاں ہیں آج ہماری

سوسائٹی میں بدرجہ اُتم پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح سے گمراہ قوموں کو اگر ہم دیکھنا چاہیں تو انہوں نے دراصل ہر چیز کے مقام کو بدل دیا۔ مفسرین کا خیال یہ ہے کہ مغضوب تو یہودی ہیں اور جو گمراہ ہیں وہ نصاریٰ یعنی عیسائی ہیں۔ عمل کرنے والے لوگ ہیں لیکن ان کے پاس علم ہی نہیں رہا، سچا علم کھو گیا اور سچے علم کے کھو جانے کے بعد انہوں نے اپنی مرضی کا دین بنا لیا۔ مثلاً آج کی عیسائیت پر کتنی بڑی چھاپ ہے پولس [Polos] کی جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر یہودی تھا اور اس نے عیسائیت کے اندر چار بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں جو دراصل چار گمراہیوں کی نشانیاں ہیں اور ہم اسی حوالے سے ساتھ ساتھ اپنا تجزیہ بھی کرتے جائیں گے۔

[1] **انہوں نے انبیاء علیہم السلام کا مقام بدل دیا**، نبی کو خدا کر دکھایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ رسول اللہ ہیں، انہوں نے کہا نہیں اللہ کے بیٹے ہیں۔

کیا آج ہماری سوسائٹی میں ایسا نہیں ہے؟

کیا لوگوں کی ایک کثیر تعداد ایسی نہیں ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل حیثیت کو بدل دیا؟

کیا آج مسلمانوں میں یہ جھگڑا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں یا نور؟

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجیے کیجیے مثلاً ایک نعت کے اس شعر کو دیکھیے:

؎ کعبے کی عظمتوں کا منکر نہیں ہوں میں

کعبے کا بھی کعبہ میٹھے نبی کا روضہ

دیکھئے مقام بدل دیا یا نہیں؟ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش بڑی بات ہے

لیکن

؎ عرش عُلا سے اعلیٰ میٹھے نبی کا روضہ۔

جب کبھی کسی قوم نے نبی کے مقام کو بدلا، وہ کبھی ہدایت کے مقام پر نہیں رہ سکی، وہ گمراہ ہوگئی۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دعا کرو:

''اے اللہ! گمراہوں کے راستے پر نہ چلانا۔''

[2] انہوں نے دنیا کی ضرورتوں کے مطابق دین کو بدل ڈالا۔ آج اپنی سوسائٹی میں دیکھیں کیا ایسا ہی نہیں ہے؟ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب تو اس لیے بھیجی کہ اسے زندگی کی کتاب بنایا جائے، اس کو سمجھا جائے، اس کے مطابق عمل کیا جائے، اس کی دعوت دی جائے، اس کے نظام کے نفاذ کے لیے کوششیں کی جائیں لیکن آج صورتحال کیسی ہے؟ اس کتاب کے ساتھ کیسا تعلق ہے؟ ایسی خواتین یا ایسے مولوی حضرات کو بُلا لیا جاتا ہے جو قبروں پر بیٹھ کر قرآن پڑھتے رہیں یا گھروں کے اندر قرآن خوانیاں کر لیں، بس کافی ہے باقی سب کچھ ویسے ہی چل رہا ہے اور برکت حاصل ہو رہی ہے۔ قرآن کے ساتھ کیسا رویہ ہو گیا؟ کوئی گھر آ کر ہمیں ناظرہ قرآن پڑھا جائے یا کسی نے ترجمہ پڑھانا ہے تو گھر آ کر پڑھا جائے۔ جب ماحول نہیں ہو گا تو پھر آخر تبدیلی کہاں سے آئے گی؟

اگر آپ بڑے پیمانے پر دیکھیں تو

معیشت میں قرآن مجید کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

معاشرت میں اسلام کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

ہمارے شادی بیاہ کے معاملات ہوں۔

تقریبات ہوں۔

آپس کے تعلقات ہوں۔

ہر جگہ پر اپنا ضابطہ، اپنے طور طریقے، اپنی مرضی، چاہے ہندو کلچر کے تحت رنگے جائیں یا کسی اور کلچر کے تحت، کوئی پرواہ نہیں۔ ''ایسا کرنا پڑتا ہے'' یہ فقرہ اتنا کہا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے رسول اللہ ﷺ کی باتیں سچی ہیں لیکن کیا کریں عمل نہیں ہوسکتا، یوں لگتا ہے ہر کسی نے اپنی پسند کا دین نکالا ہوا ہے۔ اسی طرح جب کبھی میلاد کی مجلس کروائی یا درسِ قرآن ہوا تو وہاں پر خوب اچھی طرح سے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھ گئے اور جب کوئی دوسری تقریب ہوئی تو اُس میں اس کے مطابق ڈھل گئے اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے رویہ اختیار کرلیا۔ دین کا ایک نیا version تیار ہوگیا ہے۔ یہ گمراہوں کا خاص طریقۂ کار ہے، عیسائی بھی اسی طرح سے خراب ہوئے تھے اور آج مسلمانوں کی بھی وہی صورتحال ہے، اُن کے ہاں یہ تھا کہ آپ جتنے بھی گناہ کرلو پادری آپ کے لیے دُعا کرے گا اور آپ کے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ ہمارے ہاں اسی طرح کی ایک اور صورت ہے، باقاعدہ لوگوں سے دعائیں کرائی جاتی ہیں اور اس کے بعد مطمئن ہوجاتے ہیں کہ مجھے چونکہ فلاں نے دعا دے دی ہے اب مجھے میرے گناہ خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ اسی طرح کچھ لوگ ہیں کہ جمعرات کی جمعرات مخصوص جگہوں پر دعا کروانے جاتے ہیں تاکہ جو ایک جمعرات سے دوسری جمعرات تک کے گناہ ہیں وہ کسی مخصوص صاحب کی دعا کی وجہ سے معاف ہوجائیں۔

[3] **پولس نے عیسائیت میں جس اگلی گمراہی کا اضافہ کیا وہ بپتسمہ کی رسم تھی۔** پیلا رنگ پانی میں ڈال کر پیدا ہونے والے بچے کو یا عیسائیت قبول کرنے والے کسی فرد کو اس سے نہلا دیتے ہیں اور پھر یہ تصور کرلیا جاتا ہے کہ وہ فرد عیسائیت میں داخل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا:

صِبْغَةَ اللّٰهِ [البقرۃ:138] ''اللہ تعالیٰ کا رنگ''

پانی سے تو نہیں چڑھتا، بندگی سے چڑھتا ہے، غلامی سے چڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون رنگنے میں اچھا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا رنگ جب چڑھتا ہے تو

انسان کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے۔

اس کا مزاج بدلتا ہے۔

اس میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے معاملات بدل جاتے ہیں۔

اس کا اٹھنا بیٹھنا بدل جاتا ہے۔

اس کی معاشرت، معیشت بدل جاتی ہے

اور اس کی زندگی کا مشن بدل جاتا ہے۔

[4] **چوتھا گمراہ تصور جو عیسائیوں کے اندر موجود ہے وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے گناہوں کی بھینٹ چڑھ گئے**، اللہ تعالیٰ نے اپنا بیٹا بھیجا اور اس نے ہمارے گناہوں کی خاطر اپنی جان دے ڈالی، اب عیسائی جو جی چاہے کر لیں انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معاف کر دیے گئے۔

امتِ مسلمہ نے بھی ایسا ہی طریقہ اختیار کر لیا کہ ہم جو جی چاہے کریں ہماری شفاعت ہو جائے گی۔ یہاں سورۃ الفاتحہ کے توسّط سے ربّ العزت نے یہ فرمایا کہ تم یوں دعا کرو:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ [6] صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ [7]

''[اے اللہ!] ہمیں سیدھے راستے پر چلانا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے

انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔"

اس سورۃ کے حوالے سے جو چیز توجہ طلب ہے وہ اللہ تعالیٰ اور بندے کا رشتہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت ہے کہ وہ الرّحمٰن ہے۔

انعام یافتہ لوگ الرّحمٰن کے ساتھ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆دنیا میں اس کی رحمتوں کو یاد کرنے والے ہوتے ہیں۔

☆آخرت میں اس کی رحمت پانے کے لیے دنیا میں کوشش کرتے ہیں۔

اس کے برعکس مغضوب اور گمراہ شخصیات[Unwanted Personalities] کا الرحمٰن سے کیسا تعلق ہوتا ہے؟

☆وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے غلط توقعات باندھتی ہیں۔

☆اس کی رحمت کو دنیا میں بھی اپنا حق سمجھتی ہیں اور آخرت میں بھی بغیر کوشش کے اسے اپنے لیے خاص سمجھتی ہیں۔ چوری کر لی تو کہا اللہ غفور رحیم ہے، ڈاکہ ڈالا تو خود کو سمجھا دیا کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، مالی بدعنوانیاں کیں، کرپشن کی تو یہی سوچ لیا کہ اللہ غفور رحیم ہے، ان خوش فہمیوں کا جو لوگ شکار ہیں [The Most unwanted Personalities] جن کو اللہ تعالیٰ ہرگز پسند نہیں کرتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے کبھی اپنے راستے پر نہیں چلانا، ان کے لیے یہی بات فتنہ بن جاتی ہے کہ وہ رحمت کا غلط تصور اپنے ذہن میں بیٹھا لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ دوسری صفت ہے کہ وہ الرّحیم ہے: بے حد مہربان، مسلسل رحم کرنے والا۔

انعام یافتہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہیں وہ الرّحیم کے ساتھ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆اس کی مہربانیوں پر شکر کرنے والے ہوتے ہیں۔
☆دنیا و آخرت میں اس کی رحمت پانے کے لیے دعائیں کرنے والے ہوتے ہیں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

''اے ہمارے ربّ! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچالے۔'' [البقرة:201]

جو اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین رکھتے ہیں، وہ کس طرح سے رحمت کی دعا کرتے ہیں؟

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ [القصص:24]

''پروردگار! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں۔''

دوسری طرف مغضوب اور گمراہ لوگ الرّحیم کے ساتھ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟
☆اللہ ربّ العزت کی مہربانیوں کا احساس نہیں کرتے۔
☆غافل اور glamourize رہتے ہیں۔
☆دنیا کے نشے میں مست رہتے ہیں۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔
زندگی یونہی تمام ہوتی ہے۔

☆زندگی کے بارے میں سوچتے ہی نہیں کہ یہ ملی کس لیے تھی؟

اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت جو یہاں بتائی گئی وہ ربّ العالمین ہے۔

جو ربّ العزت کے پسندیدہ بندے ہیں، انعام یافتہ، وہ سارے جہانوں کے بادشاہ

کے ساتھ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆رب العزت کی تخلیقات کے بارے میں جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔

☆ان پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

جتنا زیادہ کوئی ربّ کی ربوبیت کو سمجھتا ہے اتنا ہی زیادہ شکر ادا کرتا ہے۔

جو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ بندے ہیں، گمراہ ہیں، مغضوب ہیں، وہ رب العالمین کے ساتھ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆اللہ تعالیٰ کی تخلیقات پر غور وفکر نہیں کرتے۔

☆اس کو اپنی ذمّہ داری بھی نہیں سمجھتے۔

☆ پھر اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت ہے کہ وہ روز جزا کا مالک ہے۔

انعام یافتہ لوگ روزِ جزا کے مالک کے ساتھ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف رکھتے ہیں۔

☆اس کی جزا کی امید رکھتے ہیں۔

نبی ﷺ نے ایک مرتبہ ایک ہی آیت پڑھتے پڑھتے ساری رات گزار دی تھی:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ج وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ [المآئدہ:118]

''اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ ہی کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔''

اس کے برعکس جو اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے پر صحیح انداز میں یقین نہیں رکھتے، جو گمراہ ہیں، جو مغضوب ہیں ان کی کیا خصوصیت ہوتی ہے؟

☆اللہ تعالیٰ کی سزا سے بے خوفی اختیار کرتے ہیں۔

☆اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے۔

☆کوئی احساس دلا دے تب بھی یہ کہتے ہیں کہ ڈرانے والی باتیں نہ کریں کیونکہ ظاہر ہے کہ اس سے انسان کو خوف آتا ہے اور خوف سے انسان کا رویہ بدلتا ہے لیکن انسان خوف کھانا نہیں چاہتے۔

☆اللہ تعالیٰ کی جزا کے لیے کوئی محنت نہ کرنے والے یعنی یوں نہیں ہے کہ اپنی زندگی میں اگر پتہ لگ گیا کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے تو اس کی سزا سے بچنا چاہیں، بچنا ہی نہیں چاہتے، غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ وہ ہمیں اس رویے سے بچا لے۔

اللہ تعالیٰ کی پانچویں صفت اس کا معبودِ حقیقی ہونا ہے۔

معبودِ حقیقی سے انعام یافتہ لوگوں کا تعلق کیسا ہوتا ہے؟

☆اس کی عبادت کرتے ہیں۔

☆اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

اور دوسری طرف جو مغضوب اور گمراہ لوگ ہیں، عبادت سے منہ موڑنے والے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی [طٰہٰ:124]

''اور جو میرے ''ذکر'' [درسِ نصیحت] سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اُٹھائیں گے۔''

لیکن دنیا کی زندگی میں معبودِ حقیقی سے یہ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆اسی کی عبادت اور غلامی سے منہ موڑتے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے غضب کو آواز دینے والی بات ہے۔

☆اطاعت کو اپنے لیے ضروری ہی خیال نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کی چھٹی صفت ہے کہ وہ مددگار ہے۔

اس مددگار سے انعام یافتہ لوگوں کا کیسا تعلق ہے؟

☆وہ صرف اسی سے مدد چاہتے ہیں۔

☆اس کے سوا باقی سب سہاروں سے بے نیاز رہتے ہیں

اس کے مقابلے میں جو مغضوب لوگ ہیں، گمراہ ہیں، وہ کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆وہ اپنی اور دوسروں کی قوت بازو پر بھروسہ رکھتے ہیں اور یہی ایسا رویہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ساتویں صفت ہے کہ وہ ہدایت دینے والا ہے

ہدایت دینے والے ہادی سے انعام یافتہ لوگوں کا کیسا تعلق ہوتا ہے؟

☆ہدایت اور رہنمائی کے لیے اپنے آپ کو محتاج محسوس کرتے ہیں۔

☆ہدایت کو طلب کرنے والے اور اس کے لیے کوششیں کرنے والے ہوتے ہیں۔

نبی ﷺ کی بڑی خوبصورت دعا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۤ اَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَ التُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی[مسلم6904]

’’اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ، پاکدامنی اور تونگری کا سوال کرتا ہوں۔‘‘

اس کے مقابلے میں مغضوب اور گمراہ لوگوں کا کیا رویہ ہوتا ہے؟

☆اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے لاعلم رہتے ہیں۔

☆ہدایت دینے والے علم کو اپنے لیے ضروری خیال نہیں کرتے۔

☆اللہ تعالیٰ کی کتاب کے لیے زندگی میں ان کے پاس کوئی وقت ہی نہیں ہوتا جس میں وہ اسے اپنے لیے ضروری خیال کریں۔

☆لاعلمی اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے لاعلم بھی رہنا چاہتے ہیں اور اس پر عمل بھی نہیں کرنا چاہتے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اس لاعلمی اور بے علمی کے رویے سے بچالے۔

اللہ تعالیٰ کی آٹھویں صفت ہے کہ وہ انعام فرمانے والا ہے، ’’اَلْمُنْعِمُ‘‘ ہے۔

انعام یافتہ لوگ ’’اَلْمُنْعِمُ‘‘ سے کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ ربّ العزت نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ[توبہ:111]

’’حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔‘‘

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کی جنت پر یقین رکھتے ہیں

☆وہ جان اور مال سے جہاد کرتے ہیں۔

☆اللہ تعالیٰ کے نظام کو قائم کرنے کے لیے پوری کوشش کرتے ہیں۔

☆اس کا علم بھی حاصل کرتے ہیں

☆اس علم کو پھیلانے کے لیے باقاعدہ مال بھی لگاتے ہیں، وقت بھی لگاتے ہیں

☆پھر آگے بڑھ کر اس کے نظام کو چلانے اور غالب کرنے کے لیے پوری کوششیں کرتے ہیں۔

اس کے برعکس جو مغضوب اور گمراہ لوگ ہیں

☆وہ اللہ تعالیٰ کے انعام کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔

☆دنیا کے فانی انعامات طلب کرتے رہتے ہیں۔

میرا تجربہ ہے کہ جتنی دعائیں کروانے کے لیے لوگوں کی طرف سے آتی ہیں صرف فانی دنیا کے انعامات طلب کرنے کے لیے، فانی دنیا کے انعامات بھی اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنے ہیں، اولاد بھی اسی سے مانگنی ہے، رزق بھی مانگنا ہے لیکن کیا صرف فانی دنیا کے لیے؟

یہ گمراہ لوگوں کی خصوصیت ہے کہ وہ صرف دنیا تک ہی اپنی سوچ کو محدود رکھتے ہیں اور آخرت کے انعامات کے حوالے سے صرف خوش فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

ربّ العزت نے اپنی نویں صفت بتائی کہ وہ غیظ وغضب کا اظہار کرنے والا ہے، القہار ہے، الجبار ہے۔

انعام یافتہ لوگوں کا تعلق کیسا ہوتا ہے؟

☆وہ اس کے غیظ وغضب سے ڈرنے والے

☆اور اس کی پناہ مانگنے والے ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس مغضوب اور گمراہ لوگ القہار اور الجبار سے کیسا تعلق رکھتے ہیں؟

☆اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔

☆اس کے انتقام میں گھِر جانے پر صرف وقتی طور پر دعائیں کرتے ہیں، تب کہتے ہیں کہ یا اللہ! آپ مدد فرما دیجئے۔

آخری صفت جو ربّ العزت نے بیان کی وہ بہت ہی زیادہ توجہ طلب ہے کہ جیسے غیظ و غضب کی بات تھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ گمراہ کر دینے والا بھی ہے۔

جو انعام یافتہ لوگ ہیں

☆وہ گمراہی سے پناہ مانگنے والے ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جو مغضوب اور گمراہ ہونے والے ہیں:

☆گمراہی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ نہیں مانگتے، اس لیے بھٹک جاتے ہیں۔

☆اپنی گمراہی کو محسوس بھی نہیں کرتے، اپنی جہالت پر کبھی نہیں کڑھتے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس راستے پر چلنے سے بچالے جو "**مغضوب علیھم**" کا راستہ ہے یا جنھوں نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا اور ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا دے جن پر اس نے انعام فرمایا اور اس کے لیے ہمارے دلوں کے اندر سچی طلب پیدا کر دے۔

تین طرح کے لوگ ہیں یعنی منزل کی طرف جانے کے تین راستے ہیں:

[1] انعام یافتہ لوگوں [2] **مغضوب علیھم** [3] گمراہ

انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلنے کے لیے ہم نے کیا کرنا ہے؟

☆صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ کی تعلیم حاصل کرنی ہے اور اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔

☆مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت دینی ہے۔

☆اپنا وقت، مال، صلاحیتیں، قوتیں، روابط سب کچھ اس راستے میں لگانا ہے۔

☆مسلمانوں کو اس راستے پر چلنے کے فوائد بتانے ہیں اور اس راستے کو چھوڑنے کے نقصانات سے آگاہ کرنا ہے۔

☆اس راستے پر خود چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لیے فورمز بنانے ہیں، مراکز بنانے ہیں تاکہ لوگوں کے لیے آسانیاں فراہم ہو جائیں۔

☆مسلمانوں کو اسلام کے راستے پر چلانے کے لیے انہیں متحد کرنا ہے۔

☆کفار کے پروپیگنڈوں کی حقیقت کو ان پر واضح کرنا ہے۔

☆وقت آنے پر جہاد کرنا ہے۔

آخری بات!

سورۃ الفاتحہ دعا ہے اور قرآن اس دعا کا جواب ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، نصف اپنے لیے اور نصف اپنے بندے کے لیے اور میرے بندے کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ طلب کرے:

جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے نے میری حمد اور تعریف کی''۔

جب وہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے نے میری ثنا کی''۔

جب وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے نے

میری بڑائی بیان کی''۔

جب وہ کہتا ہے کہا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو اس نے طلب کیا''۔

جب وہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے وَلَا الضَّآلِّیْنَ تک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور اس کے لیے وہ کچھ ہے جو اس نے مانگا''۔[مسلم878]

زندگی میں بس اسی سے مانگتے رہنا ہے۔اس کی مدد کے ہم محتاج ہیں۔بندہ محتاج ہے اور ربّ کو کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ہمیں اپنی زندگی کے لیے، اپنی منزل، اپنی جنت تک پہنچنے کے لیے ربّ کی مدد کی ضرورت ہے لیکن اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کی مدد اسی کو نصیب ہو سکتی ہے

☆ جو اس کی طلب رکھے۔

☆ جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنا چاہے۔

☆ جو اپنے عمل سے یہ ثابت کردے کہ واقعی وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا مستحق ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ تو دنیا و آخرت دونوں میں مہربان ہو جاتے ہیں۔

اپنے بارے میں ضرور سوچیں کہ تین گروہ جن کے بارے میں ہم نے دیکھا اُن میں سے ہمارے اندر کس گروہ کی کون سی باتیں پائی جاتی ہیں؟ اپنا جائزہ اس لیے لینا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی برائیاں دور کرنے کی اور اچھی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔[آمین]

[سی ڈی سے تدوین، تعلیم القرآن 2006ء]

ایک انسان پر جب اللہ تعالیٰ کا رنگ چڑھتا ہے تو

انسان کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے۔

اس کا مزاج بدلتا ہے۔

اس میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے معاملات بدل جاتے ہیں۔

اس کا اٹھنا بیٹھنا بدل جاتا ہے۔

اس کی معاشرت، معیشت بدل جاتی ہے

اور

اس کی زندگی کا مشن بدل جاتا ہے۔

نگہت ہاشمی